حدیث افتراقِ امت

امتِ محمدیہ کے ۷۳ فرقے

۳

جناب مولانا سید محمد بدر عالم صاحب میرٹھی ندوۃ المصنفین دہلی

فرقوں کی یہ کثرت پھر امت محمدیہ کی عقلاء کے لئے عجب گرداب حیرت بن رہی ہے۔ ایک مفکر یہ سوچ رہا ہے کہ افتراق و تشتت کی اتنی کثرت میں آخر راز کیا ہے پھر امتِ محمدیہ کے ۷۲ فرقوں کو دوزخی کہدینا اور صرف ایک فرقہ کو جنتی کہنا اس کے لئے اور بھی مشکل کا ساماں بنا ہوا ہے ادھر ایک مورخ صفحاتِ عالم کی ورق گردانی کرکر کے تھکا جاتا ہے مگر اس کا بیان حدیث کے عدد سے ٹکر نہیں کھاتا بہت حساب لگاتا ہے مگر کبھی یہ عدد گھٹ جاتا ہے کبھی بڑھ جاتا ہے، ان الجھنوں سے گھبرا کر جب وہ نظر اوپر اٹھاتا ہے تو اس کو ایک راہ یہی آسان نظر آتی ہے کہ وہ اس حدیث ہی سے دستبردار ہو جائے جس غریب کو یہ پہلا موقع پیش آیا ہو اس کا گھبرا جانا کچھ موجب تعجب ہی نہیں۔

احادیث میں مفہومِ عدد کی بحث

لیکن ایک محدث جب ان مشکلات پر گذرتا ہے تو دنیا کی حیرت اس کے لئے خود موجب حیرت بن جاتی ہے وہ اعداد و شمار کی بحث کو کچھ اہمیت ہی نہیں دیتا۔ وہ جانتا ہے کہ اعداد و شمار صرف وقتی استحضار اور متکلم کے ذہنی اعتبار کی ایک بات ہوتی ہے کبھی وہ ابہام و اجمال کا ارادہ کرتا ہے تو عدد میں بھی پوری تفصیل اختیار نہیں کرتا اور کبھی تفصیل پر اترتا ہے تو عدد کی بھی تفصیل کر ڈالتا ہے۔ طبیعت کے انشراح اور وقت و ماحول کی وسعت کے لحاظ سے دونوں صورتیں اختیار کر لینا معقول بات ہے افراد کو انواع اور انواع کو اجناس کے تحت میں داخل کرتے چلے جایئے تو عدد گھٹتا چلا جائے گا اور اس کے برعکس اجناس و انواع کی تحلیل کرتے جایئے تو وہی

عدد بڑھتا چلا جائے گا۔ ان دونوں باتوں میں کوئی اختلاف نہیں سمجھا جا سکتا۔

اعداد و شمار میں مؤرخ کا اختلافِ نظر

اسی طرح اگر کوئی مورخ فرقہائے عالم کے متعلق کوئی عدد لکھتا ہے تو یہ اس کی طبیعت پر منحصر ہے کہ وہ کس فرقہ کو کتنی تاریخی اہمیت دینا چاہتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض معمولی فرقے اس کے نزدیک تاریخی لحاظ سے قلمبند کرنے کے قابل ہوں اور بعض بڑے فرقے یہ اہمیت نہ رکھتے ہوں۔ ہر مورخ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مقرر کردہ معیار کے لحاظ سے جو عدد چاہے ذکر کرے یہاں تطبیق و اختلاف کا کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس مورخ کا معیار اور اس کی اہمیت و غیر اہمیت کا اندازہ نہ لگا لیا جائے، پھر یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اس کے اس معیار سے اتفاق رائے بھی کرلے۔ ہر شخص کا ذوق اور اس کا نقطۂ نظر علیحدہ ہو سکتا ہے اس لئے اس کو حق حاصل ہے کہ وہ کوئی دوسرا معیار مقرر کرلے ان معمولی مقامات پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

یہاں ہم آپ کے سامنے اسی نوع کی چند احادیث پیش کرتے ہیں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ احادیث میں یہ دن رات کی باتیں ہیں۔ حدیث کی وضع و صحت کا فیصلہ ان پر نہیں ہو سکتا۔

اختلافِ عدد کی چند مثالیں

(۱) احادیث شعب الایمان میں ایمان کے شعبوں کا عدد کہیں ۷۰ سے اوپر اور کہیں ۶۰ سے اوپر بتلایا گیا ہے۔ کیا ۶۰ کو پھیلا کر ۷۰ یا ۷۰ کو سمیٹ کر ۶۰ کہنا کوئی بہت ہی بعید از حقیقت بات ہے۔

(۲) بعض احادیث میں رؤیا صالحہ کو نبوت کا چھیالیسواں جزء اور کہیں اس کے خلاف بتلایا گیا ہے۔ احادیث میں یہاں سخت اختلاف ہے۔

(۳) احادیث تقسیم رویا میں کہیں ثلاثی تقسیم مذکور ہے اور کہیں ثنائی۔

(۴) خصائص نبوت کے سلسلہ میں کہیں ۵ خصائص مذکور ہیں اور کہیں زیادہ۔

(۵) امت کے شہداء کے عدد میں بھی بڑا اختلاف ہے۔

(۶) کُنتُم خیر اُمّت کی تفسیر میں صاحب مشکوٰۃ نے جامع ترمذی کی ایک حسن روایت نقل کی ہے

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ تم ۷۰ امتوں میں وہ آخری سترویں امت ہو جو خدا کو سب امتوں میں پیاری امت ہے۔ کیا نہیں ہو سکتا کہ اس امت کا سترویں امت ہونا تفاوتِ درجات اور مراتبِ خیریت کے لحاظ سے ہو۔

(۷) جامع ترمذی میں ہے کہ اہلِ جنت کی ایکسو بیس صفیں ہیں ۸۰ امت محمدیہ کی اور بقیہ دوسری امتوں کی۔

(۸) صحیح احادیث میں دجالوں کا عدد کہیں تیس اور کہیں ۷۰ تک بھی موجود ہے وغیرہ وغیرہ

اختلافِ عدد کے مختلف جوابات اس قسم کی احادیث میں علمار کے مختلف نظریات ہیں کوئی محض اپنی ذہانت سے نکتہ طرازیاں کرکے ان مختلف عددوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے کوئی یہ عذر کرتا ہے کہ ایک وقت آپ کو اس عدد کا علم دیا گیا تھا اس کے بعد اس سے زیادہ کا علم دیدیا گیا۔ محدث مزاج اگر قرائن دیکھ لیتا ہے تو کبھی کبھی اضطراب کی بھی ٹھہرا دیتا ہے۔ محاوراتِ کلام سے ذوق رکھنے والا اس عدد کو صرف تکثیر کے لئے سمجھتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ جواب ان اعداد میں تو درست ہے جہاں محاورۂ عرب میں وہ عدد تکثیر کے لئے مشہور ہو جیسا ۷۰ کا عدد۔ آیت ذیل میں یہی تکثیر کے معنیٰ مراد ہیں۔

اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً — اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی استغفار کریں تو

لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ — بھی ہرگز ہم ان کی مغفرت نہیں کریں گے۔

اب احادیثِ بالا پر غور کیجئے کیا اگر شعب الایمان شمار کے بعد حدیث کے مذکورہ بالا عدد سے کم و بیش ثابت ہوں تو صحیح بخاری کی اس حدیث کو ضعیف یا موضوع کہدیا جائے گا یا اگر دجالوں کا عدد تاریخی لحاظ سے احادیث کے عدد کے موافق ثابت نہ ہو تو اس سارے ذخیرہ احادیث کو ناقابلِ اعتبار ٹھیرا دیا جائیگا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جن دجالوں کا حدیث میں تذکرہ کیا گیا ہے ان کے عدد شمار میں کسی خاص صفت کی رعایت کی گئی ہو۔ حافظ ابنِ حجر فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں صرف ان دجالوں کا عدد بیان فرمایا ہے جن کو قوت و شوکت حاصل ہو گی ورنہ دعویٰ نبوت

بسا اوقات سوداویت اور جنون کی وجہ سے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے مدعیین نبوت بے شمار گذرے ہیں ان سے حدیث میں کوئی بحث نہیں۔

صحیح بخاری کتاب الفتن میں ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے امرار جور کے نام (ظالم بادشاہوں کے نام) بتلائے گئے ہیں اگر میں چاہوں تو ان کا نام ونسب تک بتلا سکتا ہوں۔ اس حدیث سے گمان ہو سکتا ہے کہ شاید تمام امرارِ جور کے نام ان کو بتلائے گئے تھے لیکن حضرت حذیفہؓ سے مشکوٰۃ شریف میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ان قائدینِ فتن کے نام بتلائے ہیں جن کے ساتھ تین سو یا اس سے زیادہ کی جماعت ہوگی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں عدد وشمار بیان کرتے وقت ضرور کوئی معیار ہوتا ہے۔ حسن اتفاق سے وہ معیار یہاں ہمارے سامنے آگیا ہے ورنہ حضرت حذیفہؓ کے متعلق ہم یہی سمجھتے تھے کہ ان کو ہر ہر قائد فتنہ کا نام بتلا دیا گیا تھا۔ احادیثِ فتن میں اس عام ابہام وانتشار کے علاوہ ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اسی قسم کی روایات احادیثِ حلال وحرام کی طرح عام صحابہ سے دستیاب نہیں ہوتیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علم کا مخاطب ہر ذی فہم اور غیر ذی فہم بنایا نہیں جا سکتا اس لئے اور ابہام واجمال پیدا ہو جاتا ہے مگر یہ ابہام اس لئے مضر نہیں ہوتا کہ فتنے جب سامنے آتے ہیں تو اہلِ بصیرۃ پر ان کا فتنہ ہونا مخفی نہیں رہتا۔ اس تشخیص وتعیین کی ہمیں تکلیف نہیں دی گئی کہ یہ فتنہ کونسا فتنہ ہے۔ اسی طرح حدیث زیرِ بحث میں امت کے افتراق کی پیش گوئی کی گئی ہے اس کا مقصد اس افتراق سے آگاہ کرنا اور ان گمراہیوں کے دور میں اس کی تاکید کرنا ہے کہ دامنِ سنت اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے اسی لئے صحابۂ کرام نے اس حدیث کو سن کر یہ سوال نہیں کیا کہ وہ فرقے کون سے ہیں ان کی علامات کیا ہیں بلکہ یہ پوچھا ہے کہ وہ ایک فرقہ ناجیہ کونسا فرقہ ہے کیونکہ عملی لحاظ سے یہی مفید ہے کہ اس کے فرقہ کی تعیین ہو جائے جب یہ ایک ہی فرقہ ہے تو اس کے سوا جتنے فرقے ہیں وہ بلا بحث کئے خود بخود باطل فرقے ہوں گے۔ اس لئے صحابہ کے نزدیک اس بحث میں پڑنا ہی ایک دماغی تعزیہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

پس جب تک کہ عدد وشمار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نقطۂ نظر معلوم نہ ہو جائے مستقیم
لاسناد احادیث کو ضعیف یا موضوع قرار دینا بڑی جسارت اور انتہائی دلیری ہوگی۔ حدیث افتراقِ
مت بھی اسی سلسلہ کی ایک حدیث ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں بھی کسی خاص معیارِ ضلالت وفتنہ کے
عتبار سے یہ خاص عدد بتلایا گیا ہو۔

پھر امت کے ۷۳ فرقوں کا مسئلہ کوئی عقیدہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ سلسلۂ فتن وانقلابات
ی ایک پیشگوئی ہے اور اس باب کی عام احادیث کی طرح اس کے بھی بہت سے پہلو مبہم ہیں انھیں اپنے
حال پر مبہم رہنے دو۔ اس ابہام کی وجہ سے حدیث کو موضوع یا ضعیف کہنا بے معنی ہے۔

پیشگوئی کی احادیث میں ابہام ناگزیر ہے

فنِ حدیث پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ دورِ فتن اور مستقبل کے واقعات کی
احادیث میں اکثر ایک نوع کا ابہام ہوتا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جزئیات
ی جب تعیین کی جاتی ہے تو علی العموم وہ الفاظ کلیات کا جامہ پہن لیتے ہیں اور اس لئے جب انسان
اس کو اپنے محل پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتا ہے تو جتنی صفائی سے اس کا دل چسپاں کرنا چاہتا ہے،
چسپاں نہیں کر سکتا مثلاً تھوڑی دیر کے لئے آپ فرض کر لیجئے کہ زید کی شکل وصورت آپ قیدِ الفاظ میں لانا
چاہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کا رنگ یہ ہے نقشہ یہ ہے اور بہت سے بہت اس کا طول وعرض
بتا سکتے ہیں۔ مگر کیا یہ سب الفاظ اتنی تعیین پیدا کر سکتے ہیں کہ پھر دوسری صورت پر اس کا صادق کرنا ممکن
ہی نہ ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی یہ قیود خود زید ہی کی صورت کی تشخیص میں اور صعوبت پیدا کر دیں۔ جب
ایک نادیدہ شخص کی تعیین صرف الفاظ سے پوری نہیں ہو سکتی تو مستقبل کے حوادثات کی تعیین باوجود ان کے
تنوع اور تشابہ کے کیونکر ہو سکتی ہے۔

شریعت کا ایک اہم نصب العین

اتنی تشریح شریعت کے اصل نصب العین کے بھی خلاف ہے وہ اپنے مخاطب
دماغوں کو ایسی تربیت دینا چاہتی ہے کہ جو علوم غیبیہ وہ بیان کرے وہ بلا تردد صرف
اس کے اعتماد ووثوق پر قابلِ یقین ہو جائیں اور اس تسلیم ورضا کی انھیں ایسی عملی مشق حاصل ہو جائے کہ
پھر جہاں ان کے سامنے تفصیل کر دی جائے وہاں تفصیل ہی مناسب معلوم ہو اور جہاں اجمال رکھا

جائے وہاں اجمال ہی پسندیدہ نظر آنے لگے۔ آئیے آثار ذیل میں اس تربیت کے آثار ملاحظہ فرمائیے۔

خرج عمر علی الناس	حضرت عمرؓ باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ میں تمہیں اس
فقال احرج علیکم ان	کی اجازت نہیں دیتا کہ جو واقعہ اب تک پیش نہیں آیا
تسئلونا عما لم یکن فان	تم اس کے متعلق مجھ سے فرضی سوالات کرو کیونکہ جو
لنا فیما کان شغلا۔	واقعات کہ اب تک پیش آچکے ہیں ہمیں ان کے غور و
۵۱	خوض میں ہی کافی مصروفیت رہتی ہے۔
وکان زید بن ثابت اذا سئل	حضرت زید بن ثابتؓ سے جب فرضی سوالات کئے
عن شئ یقول کان ھذا فان	جاتے تو آپ دریافت کرتے کہ کیا یہ واقعہ پیش
قالوا لا قال دعوہ حتی یکون	آچکا ہے۔ اگر کہا جاتا کہ نہیں تو فرماتے کہ جب تک
۵۲	پیش نہ آجائے اُسے رہنے دو۔

حضرت ابن عمرؓ سے استلام حجر اسود کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استلام کرتے اور بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے اس پر سائل نے یہ فرضی سوالات شروع کر دیئے کہ اگر بھیڑ ہو جائے، اگر میں نہ کر سکوں تو جواب یہ دیا ہے۔

اجعل ارائیت بالیمن ۵۳　　اپنے ان فرضی سوالات کو یمن میں ڈال

یعنی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے اس کی اتباع کی پوری کوشش کر اور خواہ مخواہ جان چرانے کے لئے فرضی سوالات مت کر۔ انسان بسا اوقات اس لئے سوالات کرتا ہے کہ وہ اس ذریعہ سے مخاطب پر جواب کا دروازہ تنگ کر کے اس کی زبان سے اپنے لئے جواز کی رخصت حاصل کر لے۔

مسروق فرماتے ہیں کہ میں نے ابی بن کعب سے کسی مسئلہ کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے پوچھا۔ کیا یہ واقعہ پیش آچکا ہے میں نے عرض کیا۔ نہیں فرمایا۔

اجمنا یعنی ارحنا حتی یکون　　ابھی تو ہمیں آرام سے رہنے دو جب پیش آجائیگا تو ہم

---

۵۱ جامع العلوم والحکم ج ۲ ص ۶۵۔ ۵۲ ایضاً ۵۳ ایضاً

فاذا کان اجتهد نا لك　　تمہاری خاطر اس میں غور کر لیں گے اور یقیناً ان کا کوئی
رأینا. ؎　　نہ کوئی حل بھی اُس وقت ہماری سمجھ میں آجائے گا۔

صرف دماغی تصریحات علی جدوجہد میں مخل ہوتی ہیں

ان کے علاوہ حضرت عمارؓ حضرت معاذ بن جبلؓ اور دیگر تابعین و علماء سے بھی بکثرت ایسے آثار مروی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ محض دماغی تصریحات میں پڑے رہنا انسان کی علمی جدوجہد کے لئے مضرت رساں ہے۔ آج بھی جس قدر بے عمل افراد پائے جائیں نظر آئیں گی ان پر غور کروگے تو ان کا مشغلہ بھی دماغی عیاشی نظر آئیگا اور بس۔ صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کے دور میں اس نظریہ کے متعلق کیا کیا فرق ہوتا گیا اس پر بحث کا یہ موقعہ نہیں ہے۔

اخبارِ غائبہ میں مذاقِ سلف

ان آثار سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ پیش گوئیوں کے سلسلہ میں مذاقِ سلف کیا ہونا چاہئے کیا انھوں نے کھلے طور پر ایک ایک بات کی حد بندی کرنے کی جراٗت کی ہوگی۔ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر خود ہی انصاف کیجئے کہ اگر کچھ وجوہات کی بنا پر ان احادیث کے بعض پہلو اسی زمانہ میں مبہم رہ گئے تو بعد میں اب کون ہے جو ان کو صاف کر سکتا ہے اور اگر نہیں کر سکتا تو کیا اس لئے اُن احادیث کی صحت پر کوئی اثر پڑنا چاہیئے۔

فرقہائے مختلفہ کی تعیین

جہاں تک ہمارا علم ہے پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان فرقوں کی نام لیکر کسی حدیث میں تعیین نہیں کی گئی ہاں کچھ ایسے اشارات ضرور ملتے ہیں جن سے ان فرقوں کی تعیین میں مدد لی جا سکتی ہے۔ نام لے لیکر مدح وذم کرنا ہماری شریعت کا دستور بھی نہیں ہے۔ فارس اور اہلِ مدینہ کے فضائل میں متعدد احادیث ملتی ہیں مگر کوئی حدیث ایسی ثابت نہیں ہوئی جس میں نام لیکر ان کا مصداق بتایا گیا ہو۔ علماء نے صرف اپنی جانب سے قیاس آرائیاں کی ہیں۔ پس جب مقامِ مدح پر نام لینا احادیث کی سنت نہیں تو مذمت کے ذیل میں کسی کا نام لینا کب اس کے بلند اخلاق کا اقتضاء ہوسکتا ہے۔ بلکہ شریعتِ محمدیہ کا یہ ایک عام قانون ہے کہ اگر سہو ونسیان کی بنا پر کسی شخص سے کوئی معصیت سرزد ہوجائے تو تا امکان اس کی پردہ پوشی ہی کرنی چاہئے حدود کے باب میں شہادت کے اندر

؎ جامع العلوم والحکم ج ۲ ص ۶۵۔

جس قدر شدت اختیار کی گئی ہے وہ بھی صرف ستر اور پردہ پوشی کی حکمت پر مبنی ہے[۵۱]۔ یعنی شریعت یہ نہیں چاہتی کہ پورے ثبوت کے بغیر فواحش اور حیاناک جرائم کی اشاعت یا کسی مسلمان کی پردہ دری کی جائے۔

مغیرہ بن شعبہ پر تہمت کی تشفی بخش تحقیق

مغیرہ بن شعبہ کے متعلق تہمتِ زنا پر حضرت عمرؓ کی دعا کا جو واقعہ مشہور ہے اس کا منشا بھی یہی تھا۔ نکتہ چینوں نے اُسے دوسرا رنگ دیا ہے اور حضرت عمرؓ کے عیوب کی فہرست میں شمار کیا ہے مگر دور بینوں نے اسی کو بڑی حکمت پر مبنی سمجھا ہے یہ فہم اور درد اسی کو میسر آسکتا ہے جس کو مقاصدِ شریعت کا پورا ادراک ہو جو اس کی رعایت کر سکتا ہے کہ اگر اسلام کے دورِ اول میں کسی مقتدر شخصیت کے متعلق کوئی غلط الزام حدِ ثبوت کو پہنچ جائے تو آئندہ نسلوں کے لئے وہ کتنا مضرت رساں ہو سکتا ہے۔

واقعہ کی حقیقت یہاں کل اتنی تھی کہ انھوں نے خفیہ طور پر نکاح کر لیا تھا وہی بڑے عنوان سے مشہور ہو گیا چونکہ اس وقت اس قسم کے نکاح کی حضرت عمرؓ نے ممانعت فرما دی تھی[۵۲] اس لئے انھیں یہ عذر کرنے کا موقعہ بھی نہ مل سکا کہ میں نے خفیہ نکاح کر لیا ہے چنانچہ جب عدمِ ثبوت کی وجہ سے مقدمہ خارج ہو گیا اور ان سے حقیقتِ حال دریافت کی گئی تو انھوں نے صاف طور پر اپنے نکاح کا حال بیان کر دیا۔[۵۳]

---

۵۱ انما امر اللہ بالعدد فی شہود الزناء لانہ مامور فیہ بالستر ولھذا اغلظ فیہ النصاب۔ (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۸۱)

اللہ تعالیٰ نے زنا کے گواہوں میں عدد اس لئے شرط قرار دیا ہے کہ ان معاملات میں (جب تک ثبوت نہ ہو) اصل ستر ہے اسی لئے نصابِ شہادت میں شبتہ زیادہ سختی اختیار کی گئی ہے۔

۵۲ حضرت عمرؓ نے یہ ممانعت اس لئے فرمائی تھی کہ عام طور پر نکاحِ سر دو وجہ سے کیا جاتا ہے یا تو اس میں شرعی مصالح کی پوری رعایت نہیں کی جاتی اس لئے اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر کھلے طور پر یہ نکاح کر لیا گیا تو شاید کسی کو اس پر اعتراض ہوگا، یا اس دعوی کو فواحش کے لئے آڑ بنایا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو ان دونوں باتوں کا سدباب منظور تھا۔ امام ابوحنیفہ نے بھی اسی قسم کے مصالح کے پیشِ نظر انعقادِ نکاح کے لئے نصابِ شہادت شرط قرار دیا ہے۔ حالانکہ کسی اور عقد میں انعقاد کیلئے

۵۳ روی ابن النحوی فی البدر المنیر ان المغیرۃ ادعی فی تلک المرءۃ التی رمی بھا انھا زوجتہ قال وکان یری نکاح السر وروی انہ کان یتبسم

ابن النحوی بدرِ منیر میں روایت کرتے ہیں کہ جس عورت کے معاملہ میں حضرت مغیرہ کو تہمت لگائی گئی تھی ان کے نزدیک وہ ان کی بیوی تھی کیونکہ خفیہ طور پر نکاح کر لینا ان کے نزدیک جائز تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب گواہ

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

علماء جرح و تعدیل نے تمام تر احتیاط کے باوجود اپنی ان نکتہ چینیوں پر جو تنقید حدیث کے سلسلہ میں انھوں نے راویوں کے متعلق کی ہیں بہت تاسف کا اظہار کیا ہے اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ شانِ ستاری ہرگز اس کے درپے نہیں ہے کہ وہ امت کے مجرمین کی برسر بازار رسوائی کا کوئی آئینی دستور تیار کرے[1]۔ یہ بنی اسرائیل جیسے باغیوں ہی کے لئے موزوں تھا کہ جب شب میں وہ کوئی گناہ کرتے تو اس کی صبح کو اپنے دروازوں پر لکھا ہوا دیکھ لیتے، یا مالِ حرام سے صدقہ دیتے تو آسمان سے آگ اترتی اور اس کو جلائے بغیر واپس ہو جاتی اور یہ ان کی رسوائی کا عام اعلان ہوتا۔ امتِ محمدیہ کے لئے اب یہ سب آئین پردہ دری منسوخ ہو چکے ہیں۔

امتِ محمدیہ کے آخری امت ہونے کی ایک لطیف حکمت

علماء نے اس امت کے آخری امت ہونے کی ایک لطیف حکمت ہی یہ تحریر کی ہے کہ اب خدا تعالیٰ نہیں چاہتا کہ اس امت کی داستانِ عمل بھی پہلی امتوں کی طرح کسی اور امت کے سامنے پڑھی جائے۔

جماعتِ منافقین کی ریشہ دوانیوں سے کتب سیرت و تاریخ بھری پڑی ہیں اس کے باوجود ان کے ساتھ شریعت کا سلوک یہی تھا کہ ان میں سے جس نے نمائشی طور پر بھی اسلام کا نقاب ڈال لیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عند شهادتهم فقيل له في ذلك فقال اني اعجب مما اريد ان افعله بعد شهادتهم فقيل وما تفعله قال اقيم البينة على انها زوجتي ذكره في البدر المنير (الروض الباسم ج ۱ ص ۱۴۷)

ان کے خلاف گواہی دے رہے تھے تو یہ کھڑے مسکرا رہے تھے جب ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو کہنے لگے کہ ان کی گواہی کے بعد جو میں کرنا چاہتا ہوں اسی کی وجہ سے مجھے ہنسی آ رہی ہے دریافت کیا گیا آپ کیا کریں گے فرمایا کہ میں اس کا ثبوت پیش کروں گا کہ یہ میری بیوی ہیں۔ اس واقعہ کو بدر منیر میں ذکر کیا ہے

(حاشیہ صفحہ ھٰذا)

[1] ابن ابی حاتم کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک دن ان کے سامنے کتاب الجرح والتعدیل پڑھی جا رہی تھی۔ محمد بن مہرویہ رازی نے کہیں ان سے یحییٰ بن معین کا یہ مقولہ نقل کیا "ہم ان لوگوں پر بھی طعن کر گذرتے ہیں جو ہم سے دو دو سال پیشتر اپنے خیمے جنت میں لگا چکے ہیں" یہ سن کر ابن ابی حاتم رونے لگے اور جسم پر ایسا رعشہ طاری ہوا کہ کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس حکایت کو پھر دوبارہ انھوں نے سنا اور پھر خوب روئے۔

اس کو رسوا نہیں کیا گیا یعنی جو مومن کا بھیس بنا کر آگیا اسے آنے دیا گیا اور جس نے زبانی اسلام کی شہادت دیدی اس کی شہادت قبول کر لی گئی۔

ماسوا اس کے افتراق و تشتت، تعصب و نخوت کے دور میں جماعتوں کو نام لے لیکر گمراہ اور دوزخی ٹھیرانا بھڑکتے ہوئے فتنوں کو اور بھڑکانا ہے۔

امام غزالیؒ کی ایک مفید نصیحت

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ عہدِ ماضی میں عوام کی گمراہی کا باعث بعض مرتبہ خود اہلِ حق کا تعصب بن گیا ہے، انھوں نے حق کی حمایت میں ناحق جماعت کو بنظرِ حقارت ونفرت دیکھا۔ جاہلوں نے صرف ان کی ضد میں اپنے جہل وعناد میں اور تشدد اختیار کر لیا۔ شدہ شدہ یہ وقتی ضد دائمی عقائد بن گئے حتیٰ کہ کلام اللہ کے حدوث وقدم کے مباحث میں یہاں تک مبالغہ آمیزیاں ہوئیں کہ جو آواز انسان کے حلقوم سے نکلتی ہے اس کو بھی قدیم کہدیا گیا۔ کاش اگر یہ مقابلے اور مناظرے نہ ہوتے تو یہ بے معنی کلمات جو بعد میں عقائد بن گئے شاید کسی مجنوں کی زبان سے بھی نہ نکلتے۔

اس عام سنت کے سوا اگر کہیں کسی جماعت یا فرد کا نام لیا گیا ہے تو کسی خاص ہی مصلحت کے لئے جس پر علماء نے اپنی جگہ کافی بحث کر دی ہے اس لئے ان فرقوں کی تعیین پر بحث کرنا قطعاً غیر ضروری ہے تاہم جب اذہان اس طرف متوجہ ہو گئے اور بحث شروع کر دی گئی تو مجبوراً ہمیں بھی کچھ لکھدینا مناسب ہے

اس موضوع پر علماءِ کلام اور علماءِ اصول دونوں نے اپنی اپنی جگہ گفتگو کی ہے ہمارے نزدیک علامہ طرطوشی کا کلام سب میں منتخب ہے اور اسی کو علامہ شاطبی نے بھی اختیار فرمایا ہے اس لئے ہم اسی کا خلاصہ اپنے الفاظ میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

یہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ حدیث میں زیرِ بحث صرف وہ اختلافات ہیں جو تفریق فی الدین کی حد میں آسکتے ہیں۔ یہ وہ افتراق ہے جو صراطِ مستقیم سے وابستہ رہ کر انحراف کے نتائج میں پیدا ہو جاتا ہے جس کا نام قرآنی لفظ میں "السبل" رکھا گیا ہے اس کا حاصل اصل دین سے منتسب رہ کر اس کے بعض اصول وکلیات کے ساتھ اختلاف کرنا ہے اس لئے یہاں اختلاف وافتراق سے امت اجابت ہی کا اختلاف وافتراق مراد ہوگا۔ امتِ دعوت کا اختلاف جس میں کفار بھی داخل ہو جائیں مراد نہیں ہو سکتا

یہ دوسری بات ہے کہ اگر یہ انحراف اپنی حد سے تجاوز کر جائے تو اس کی انتہا کفر پر بھی ہو سکتی ہے۔

حدیث کے لفظ امتی سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس اختلاف کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ لفظ امت کے تحت میں رہ کر ہی ہونا چاہئے، یہاں امت سے امتِ دعوت مراد لے لینا بہت بعید ہے کیونکہ اس امت کے اختلاف کو بنی اسرائیل کے اختلاف کے ساتھ تشبیہ دی جارہی ہے اور ظاہر ہے کہ ان کا اختلاف یہودیت و نصرانیت کے وسیع مفہوم میں داخل رہ کر ہی تھا اسی طرح اس امت کا اختلاف بھی امتِ اجابت میں رہ کر ہونا چاہئے۔ کفر اپنے تمام انواع و اقسام کے ساتھ شرعی نظر میں ایک ہی ملت قرار دیا گیا ہے۔ اس کے تشتت و افتراق کی بحث شریعت میں غیر مفید بحث ہے۔ اگر تاریخی اعتبار سے نظر ڈالی جائے تو بھی یہی نظر آتا ہے کہ اسلام میں جو مختلف فرقہ بندیاں ہوئیں ہمیشہ وہ اسلام ہی کے نام پر ہوئیں۔ خوارج کے جنگ کی تمام بنیاد یہی تھی کہ وہ اپنا قدم اسلام اور صراطِ مستقیم پر سمجھتے تھے اور حضرت علیؓ کو دائرہ اسلام سے باہر قرار دیتے تھے، معتزلہ و مرجیہ اور دیگر فرقِ باطلہ سب اپنی اپنی جگہ یہی دعویٰ رکھتے تھے کہ سیدھی راہ ان ہی کی راہ ہے دوسری جماعتیں منحرف اور حق سے ہٹی ہوئی جماعتیں ہیں ان وجوہ کی بنا پر ظنِ غالب یہ ہے کہ ان فرقوں کا ظہور صرف اسلام کے اندر مقدر ہے کفر کی جماعتیں اس میں شامل نہیں ہیں۔

فرقہ باطلہ کی پہلی علامت بغض و نفاق ہے

ان فرقہائے باطلہ کی تعیین کا راستہ اب یہی ہو سکتا ہے کہ ان کی علامات پر اصولی طور پر بحث کی جائے۔ کتاب و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انحراف، زیغ، اور افتراق کی بڑی علامت خود آپس کا اختلاف ہے پس اگر کوئی مسئلہ اسلام میں زیرِ بحث آتا ہے اور اس کی وجہ سے افتراق و تشتت نہیں پھیلتا، بغض و عداوت کی ہوا نہیں چلتی، امت کا شیرازہ منتشر نہیں ہوتا۔ آپس کی محبت و مودت ختم نہیں ہوتی تو اس کو اختلافِ مذموم نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اگر اس کا نتیجہ تحزب و تعصب کی شکل میں نمودار ہوتا ہے امت کی وحدت پارہ پارہ ہوتی ہے تو اسے انحراف کا اثر سمجھنا چاہئے۔ آیتہ ولا یزالون مختلفین کی تفسیر کے ذیل میں مجاہد فرماتے ہیں کہ مختلفین اہلِ باطل ہیں اور مرحومین کے متعلق لکھتے ہیں۔

اھل الحق لیس فیھم اختلاف — اہلِ حق میں اختلاف نہیں ہوتا۔

مطرف بن شخیر کہتے ہیں کہ اگر کہیں اہلِ اہوا میں بھی محبت و اتحاد ہوا کرتا تو یہ دہوکا لگتا کہ شاید یہی لوگ اہلِ حق ہوں لیکن جب اس نعمت سے وہ محروم ہیں تو اب ہر ذی عقل یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ اہلِ حق نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کی شانِ اختلاف و افتراق نہیں۔

حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں کہ مختلفین اہلِ اہوا اور الامن رحم ربک اہل سنت والجماعۃ ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ رحمت اختلاف نہیں کرتے [1] یہ الفاظ بتلا رہے ہیں کہ اُس وقت تک اہلِ حق کے قلوب میں فروعی اختلافات رکھنے کے باوجود کوئی بغض و عناد نہ تھا گو آج یہ سمجھنا اور سمجھانا دونوں مشکل ہیں کہ فروعی اختلاف کے ساتھ محبت کیسے قائم رہ سکتی ہے اگر غور کروگے تو موجودہ افتراق کی بنا یہ فروعی اختلافات نہیں ہیں بلکہ قلبی سرد مہری ہے ہاں بہانہ بنانے کو یہ بوجہ مذہب کے سر پر رکھ دیا جاتا ہے تاہم اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اگر رفع یدین اور آمین کے جھگڑے تحزب و تعصب اختلاف و افتراق کی صورت پیدا کرلیں تو ہرگز اس اختلاف کو بھی اہلِ حق کا اختلاف نہیں کہا جا سکتا۔

حافظ ابن قیمؒ قیاس کی مذمت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ قیاسات ہی کی بدولت امت کے کلمہ میں تفریق پھیلی اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ قیاسات خدا کی مرضی کے برخلاف ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ — اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس پر بڑا اختلاف نظر آتا۔

حضرت ابن عباسؓ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ تبیض وجوہ کا مصداق اہلِ سنت اور اہلِ ائتلاف ہیں اور تسود وجوہ کا مصداق اہل فرقت و اختلاف ہیں۔

اختلاف نہ کرنے کا حکم | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آپس میں اختلاف برپا نہ کرو ورنہ تمہارے دلوں میں بھی اختلاف پڑ جائے گا۔ اسی لئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی آیت کے مفہوم میں صحابہؓ کا

---

[1] کتاب الاعتصام ج ۱ ص ۳۹ و ۴۰۔

اختلاف دیکھتے تو آپ کو سخت ناگوار ہوتا اور آپ کو اتنا غصہ آتا کہ آپ کا روئے انور انار کی طرح سرخ ہو جاتا اور فرماتے " کیا اس بات کا تم کو حکم دیا گیا تھا" بعثت رسول کا اصل مقصد ہی رفع اختلاف ہے اس لئے جو اختلاف کرتا ہے درحقیقت وہ اس اہم مقصد پر ہی ضرب لگاتا ہے حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کو مخاطب کرکے فرمایا " اگر تم اختلاف کروگے تو تمہارے بعد والے اور زیادہ اختلاف کریں گے "

ایک دن حضرت عمرؓ کو خبر لگی کہ ابی بن کعبؓ اور ابن مسعودؓ اس مسئلہ میں اختلاف کر رہے ہیں کہ نماز ایک کپڑے میں ادا کرنا سنت ہے یا دو کپڑوں میں تو انھوں نے منبر پر خطبہ دیا اور فرمایا " جب تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہو کر ایسے ایسے مسائل میں اختلاف کروگے تو بھلا تمہارے بعد مسلمان کس کے قول کو اختیار کریں گے۔ اگر آج کے بعد میں نے سنا کہ دو شخصوں میں اختلاف ہو رہا ہے تو جو مجھے کرنا ہے کر گزروں گا "

حضرت علیؓ نے اپنے قاضیوں کو لکھ بھیجا " جیسا تم پہلے فیصلہ کیا کرتے تھے اب بھی اسی کے موافق کرتے رہو مجھے اختلاف پسند نہیں، میری تمنا ہے کہ جس طرح میرے پیشرو دنیا سے گذر گئے ہیں اسی طرح کسی اختلاف کے بغیر میں بھی گذر جاؤں "

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے " پہلی امتیں اسی عادت کی بدولت ہلاک ہوئیں کہ وہ اپنے انبیاء علیہم السلام کے سامنے اختلاف کیا کرتی تھیں " اور دوسری حدیث میں فرمایا کہ " اپنی کتاب کے بعض حصہ کو بعض کے ساتھ متعارض سمجھکر ٹکرایا کرتی تھیں قرآن اس لئے نہیں آیا کہ تم آپس میں تعارض پیدا کرکے ایک آیت کو دوسری آیت سے ٹکراؤ بلکہ اس کا ایک حصہ دوسرے کی تصدیق کرتا ہوا اترا ہے "[۱]

---

[۱] دیکھو اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۲۵ و جامع بیان العلم ج ۲ ص ۸۳ و ۸۴۔

حضرت عمرؓ کے اس خطبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی سیاسی نظر کس قدر دور بیں تھیں وہ اجتہاد کو نہیں روکتے اختلاف کو روکتے ہیں، مناظرے کو روکتے ہیں اور ایسی بحث کو روکتے ہیں جو سر دست گو اختلاف نہ کہلائے مگر آئندہ کہیں امت کے لئے اختلاف کا تخم نہ ڈالدے۔ اسی طرح قرآن میں بحث و تحیص کی ممانعت نہیں۔ ممانعت اس بحث کی ہے جس کا حاصل قرآن کی آیات میں اختلاف و تعارض ثابت کرنا ہو کوشش یہ کرنا چاہئے کہ جہاں اختلاف ہو اس کو تا امکان رفع کیا جائے جہاں تعارض نظر آئے اسے دور کیا جائے (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اسی عداوت و بغض کی رو میں بہے چلے جا رہے تھے خدائے تعالیٰ کا ان پر یہ بڑا انعام ہوا کہ اس نے ان کی بہتی کشتی اختلافات کی دبار سے نکال کر محبت و مودت کے کنارے لگا دی۔

وَاذْكُرُوا إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً	اور ذرا اس زمانہ کو بھی یاد کرو جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن
فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ	تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈالدی
فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ	اب جو صبح ہوتی ہے تو تم اس کی مہربانی سے ایک دوسرے
إِخْوَانًا۔	کے بھائی بھائی بنے ہوئے تھے۔

پس قلوب میں انس و محبت الفت و اخوت یہ خدا کی بڑی نعمت ہے اس لئے یہ حصہ اسی کا ہو سکتا ہے جو الا من رحم ربک کی فہرست میں داخل ہو چکا ہے اس کے بالمقابل اختلاف و افتراق اس نعمت سے محروم ہونے کی نشانی ہے۔ امام بخاریؒ نے کتاب الاعتصام میں ایک باب قائم کرکے لاتزال طائفۃ الخ کی حدیث نقل کی یعنی میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہے گی اس کے بعد دوسرا باب قائم کیا اور یہ آیت تحریر فرمائی "او یلبسکم شیعا" خدا تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ وہ تمہاری پارٹیاں بنا دے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ان دونوں بابوں کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت میں آئندہ اختلاف ہوگا حتیٰ کہ حق پر قائم رہنے والا صرف ایک طائفہ رہ جائیگا اس لئے آئندہ باب میں اس اختلاف کی وجہ بیان کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انواعِ عذاب میں اختیار دیا گیا تو آپ نے عذاب کی تمام قسموں میں سے عذابِ افتراق کو پسند فرمایا تھا کہ اس میں پہلی امتوں کی طرح آپ کی امت کا استیصال تو نہ تھا۔ پس معلوم ہوا کہ اختلاف و تشتت یہ ایک عذاب ہے اور خود اہلِ باطل ہونے کی نشانی ہے۔ [1]

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) نہ یہ کہ جہاں اختلاف کا کوئی شائبہ نہ ہو وہاں دماغ سوزی کرکے اختلاف پیدا کیا جائے اہلِ حق اور اہلِ اختلاف کے مزاج کا اگر اندازہ کروگے تو دونوں کی بحثوں میں ما بہ الامتیاز یہی ہوگا اُن کا مقصد بحث کرکے اختلاف مٹانا ہے اِن کا مدعا بحث کرکے اختلاف پیدا کرنا ہے۔ واللہ المستعان

[1] اگر آپ اختلاف کے صحیح معنی سمجھ گئے ہیں تو یہ کہنا غلط ہے کہ یہاں تو برعکس اہلِ حق میں اختلاف اور اہلِ باطل میں اتفاق نظر آتا ہے۔

دوسری علامت اتباع متشابہات ہے

مسئلہ کی پوری حقیقت سمجھنے کے لئے پہلے محکم و متشابہ کی حقیقت ذہن نشین کرنا ضروری ہے، قرآن کریم کہتا ہے :-

هُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۔ خدا ہی نے آپ پر کتاب اتاری ہے اس میں آیات محکمات ہیں جو کتاب کا بڑا حصہ ہے، اور دوسری آیات متشابہات ہیں۔

عربی میں لفظ اُم کے معنی اصل اور بڑے کے آتے ہیں۔ مکہ مکرمہ کو ام القریٰ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ زمین کا مرکزی نقطہ اور اس کی اصل یہی ہے، یہیں سے زمین اطراف و جوانب میں پھیلائی گئی ہے سورۂ فاتحہ کو بھی ام الکتاب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اصول کتاب پر حاوی ہے۔ ام الطریق بڑے راستہ کو کہا جاتا ہے وہ بھی چھوٹے راستوں کے پھٹنے کی اصل ہوتا ہے۔ دراصل اُم میں اصل ہونے کے ساتھ اس کے مرجع اور مرکز ہونے کا مفہوم بھی ملحوظ ہوتا ہے۔ ماں کو عربی میں اسی لئے ام کہتے ہیں کہ وہ اولاد کی اصل اور ان کا مرجع ہوتی ہے یعنی وہ اسی کے ارد گرد رہتے ہیں ضرورت کے وقت اسی کی طرف لوٹ کر آتے ہیں۔ جنگ کے بڑے جھنڈے کو بھی اُم اسی لئے کہا جاتا ہے کہ لشکر گروفر کے وقت اسی جگہ لوٹ کر آتا ہے [له]

اس لحاظ سے محکمات کے ام الکتاب ہونے کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ قرآن کا بڑا حصہ اور اصل ہیں یہ اپنی جگہ قائم رہیں گے اور قرآن کا دوسرا حصہ جو نہ اس کی اصل ہے اور نہ اتنا بڑا ہے وہ انھیں محکمات کے ارد گرد گھومتا رہے گا جب ان میں کوئی الجھاؤ پیش آئے گا تو ان ہی محکمات کی طرف لوٹ کر حل کریا

[له] اس لحاظ سے سورۂ فاتحہ کو ام الکتاب کہنے کی ایک لطیف حکمت یہ بھی ہے کہ سورۂ فاتحہ نماز میں اپنی جگہ رہتی ہے۔ بقیہ قرآن اس سے آ کر لگتا رہتا ہے۔ اب یہ بات بھی حل ہوگئی کہ ہر رکعت میں خاص سورۂ فاتحہ ہی کیوں واجب کی گئی ہے بقیہ سورتوں میں کوئی اور سورت واجب کیوں نہیں کی گئی اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن میں جو سورت اُم کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہی سورۂ فاتحہ ہے اس لئے اسی کا حق ہے کہ یہ سورت بہ حیثیت ام اپنی جگہ رہے اور بقیہ قرآن اس سے آ کر لگتا ہے۔

(از افادات حضرت استاد قدس سرہ)

جائے گا اور ام کی طرح ان کو مستقل حیثیت حاصل نہ ہوگی۔ جب آپ محکم و متشابہ کا فرق سمجھ چکے تو اب سنئے کہ محکمات و متشابہات کی اس تقسیم ہی نے یہاں خدا کی قہر و مہر کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ مومن، راسخ فی العلم کے لئے راستہ یہ ہے کہ وہ محکمات پر عمل کرتا رہے اور متشابہات پر ایمان لاتا رہے اس کے برعکس کج فطرت یہ وتیرہ اختیار کر لیتا ہے کہ قرآن کا جو کھلا ہوا حصہ ہے اسے تو متشابہات کی طرح عملاً چھوڑ دیتا ہے اور جو متشابہات ہے اس کو محکمات کی طرح زیر بحث لے آتا ہے چونکہ متشابہات خود تو اپنی مراد میں واضح نہیں ہوتے اور یہ شخص ام کتاب کی طرف رجوع نہیں کرتا اس لئے جس قدر اس کی مراد حاصل کرنے میں دوڑتا جاتا ہے اسی قدر منزلِ مقصود سے بعید تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ کہیں پہنچکر اس کی پیاس بجھے مگر اس کی تشنگی اور بڑھتی رہتی ہے اور اسی جد و جہد میں اس کی عمر تمام ہو جاتی ہے: نہ اُسے ساحلِ مراد ہی ہاتھ آتا ہے نہ اس بدنصیب کا سفر ہی تمام ہوتا ہے۔

خدائے قدوس نے حل و حرمت اور عمل کے جتنے آئین بنائے ہیں اس میں کوئی ابہام نہیں رکھا اور جہاں ابہام رکھا ہے اس پر عمل کی دعوت نہیں دی بلکہ صرف ایمان لانے کا امر کیا ہے۔ اب اگر کوئی بدنصیب صحیح راہ نہیں چلتا اور خود بھٹکتا پھرتا ہے تو یہ قصور اس کا ہے یُضِلُّ بِهٖ كَثِيرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيرًا کا راز اسی تقسیم میں مضمر ہے۔ اسی جگہ مخلص و غیر مخلص، سعید و شقی کا فرق واضح ہوتا ہے۔ شانِ تفویض و تسلیم، تمرد و سرکشی کا یہی نقطۂ امتحان ہے۔ فرقہائے باطلہ کے پھوٹنے کا یہی سرچشمہ ہے اس لئے اس پر دوبارہ پھر تفصیلی نظر ڈال لیے۔

محکم و متشابہ کی تحقیق محکم کے دو معنی ہیں ایک عام اور ایک خاص۔ خاص اصطلاح[1] میں محکم منسوخ کے بالمقابل مستعمل ہوتا ہے۔ اس بنا پر قرآن کی جو آیات منسوخ نہیں وہ سب محکمات کہلائیں گی اور جو منسوخ ہیں ان کو متشابہات کہا جائے گا۔ محکم کے عام معنی یہ ہیں کہ جو آیات اپنی مراد میں واضح اور کھلی ہوئی ہیں وہ محکمات ہیں۔ اس اصطلاح کے موافق متشابہات وہ آیات ہوں گی جو اپنی مراد میں واضح نہ ہوں خواہ بحث و تمحیص کے بعد حل ہو سکیں یا نہ ہو سکیں۔ اس بنا پر متشابہات کی دو

---

[1] یہ معنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابنِ عباسؓ سے مروی ہیں۔ (تفسیر المنار ج ۳ ص ۱۶۴)

قسمیں ہو جائیں گی (۱) حقیقی (۲) اضافی۔ متشابہ حقیقی وہ ہوگا جس کی مراد نہ خود شریعت نے بتلائی ہو نہ اس کے حاصل کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہو۔ غرض تحقیقات کے تمام دروازے بند نظر آئیں اور جو دروازہ کھلا ہوا ہو وہ صرف ایک ایمان کا دروازہ ہو قرآن کریم میں ایسے متشابہ کا وجود بہت ہی نادر ہے اور اس کا مقصد بھی بجز ایمان لانے کے اور کچھ نہیں ہے۔ آیتِ بالا میں متشابہات سے یہی معنی مراد ہیں

متشابہ اضافی قرآن کریم کا وہ حصہ ہے جس کی تفصیل خود قرآن کریم نے دوسری جگہ بیان کردی ہے۔ مثلاً کسی عام کی تخصیص یا کسی مطلق کی تقیید لیکن بے علمی یا کج فطرتی یا اتباع ہوٰی اس تحقیق کی فرصت نہیں دیتی کہ کلام کے سیاق و سباق کو دیکھا جائے۔ عام و خاص، مطلق و مقید کے ارتباط کا لحاظ کیا جائے بلکہ صرف یکطرفہ نظر کرکے قرآں کے خلاف ایک معنی پیدا کرلیتی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک شخص نے جابر جعفی سے دریافت کیا کہ ذیل کی آیت کا کیا مطلب ہے۔

فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ

اس نے جواب دیا کہ اس آیت کا مصداق ہنوز ظاہر نہیں ہوا۔ سفیان نے فرمایا کہ جھوٹ بولتا ہے۔ حمیدی کہتے ہیں کہ ہم نے سفیان سے دریافت کیا کہ اس شخص کا مطلب کیا تھا فرمایا کہ روافض کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ بادلوں میں چھپے بیٹھے ہیں جب کبھی ان کو حکم ہوگا تو اپنی اولاد کے ساتھ آسمانوں میں ظاہر ہوں گے یہ رافضی اس پر اس آیت کو چسپاں کرنا چاہتا ہے۔

اب غور کیجئے کہ آیت کا تمام سیاق و سباق صاف صاف حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے بارے میں ہے۔ یہاں اس مہمل سرتاپا کذب عقیدہ کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا مگر اس شخص نے جب آیت کو اپنے مذہب پر ڈھالنا چاہا تو اس کو اول و آخر سے علیحدہ کرکے صرف درمیانی کا حصہ پڑھا۔ اسی طرح خوارج صرف ان الحکم الا للہ رٹ لئے اور یہ نہ دیکھا کہ خود قرآن ہی میں دوسری جگہ انسانوں کی تحکیم موجود ہے۔ جبریہ کا حال بھی یہی ہے وہ بھی صرف

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ — اللہ نے تمہیں اور تمہارے عمل کو پیدا کیا۔

کو لئے بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جب ہمارے عمل بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں تو اب ہمارا اختیار

کیا رہا۔ لیکن اُسی قرآن میں جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (یہ بدلہ ہے ان کاموں کا جو انہوں نے خود کئے ہیں) بھی موجود ہے۔ جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کے افعال اس کے کسب و اختیار سے صادر ہوتے ہیں۔

غرض باطل فرقوں کا یہی دستور ہے کہ پہلے وہ ایک خیال پکا لیتے ہیں پھر اس پر قرآن سے استدلال قائم کرنے کے لئے کسی آیت کی آڑ تلاش کر لیتے ہیں اور ہوی پرستی کا رنگ چڑھا کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ اسی قرآن میں دوسری جگہ اس کی تشریح ان کے مدعا کے خلاف موجود ہوتی ہے۔ پس تشابہ اضافی بعض کے لحاظ سے تو متشابہ ہوتا ہے اور بعض کے لئے محکم ہوتا ہے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ جب خود شریعت نے مبہم کو مفصل، عام کو خاص، مطلق کو مقید کر دیا ہے تو اس کے بعد اس میں کوئی تشابہ نہیں رہتا اور اس لئے علماء کو بحث کا حق حاصل ہے اور اگر یہ دیکھا جائے کہ وہ اپنی توضیح میں ایک قاصر الفہم کے لئے دوسری آیت کی طرف رجوع کرنے کا محتاج ہوتا جس کی اس میں اہلیت نہیں تو اس کے لئے یہی کہا جائے گا کہ جس طرح تشابہات حقیقیہ کی تحقیق علماء کے لئے ممنوع تھی اسی طرح ان آیاتِ محکمات پر بحث کرنا ان کے لئے ممنوع ہے وہاں مطلقاً بحث و تحیص زیغ کی علامت تھی۔ یہاں نا اہل اور بے علموں کی بحث زیغ کی علامت ہوگی۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ تشابہ کبھی فی نفسہ ہوتا ہے کبھی اپنے قصورِ علمی کی وجہ سے نظر آنے لگتا ہے حکم دونوں جگہ ایک ہے۔ تشابہ حقیقی سب کے لئے متشابہ ہے اس لئے کسی کو بحث کرنے کی اجازت نہیں اور تشابہ اضافی جس کے حق میں متشابہ ہے خاص اس کے لئے اس پر بحث کی اجازت نہیں لیکن جب اہلِ زیغ اپنی بے علمی کا ادراک نہیں کرتے یا ادراک کے باوجود محض جسارت اور اتباعِ ہوی کی وجہ سے اس وادی میں قدم رکھ دیتے ہیں تو پھر اسی جگہ سے وہ شاخیں پھوٹنے لگتی ہیں جس کو قرآن کریم میں السبل کہا گیا ہے۔ اور اختلافِ مذموم کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔[2]

---

[1] دیکھو الموافقات ج ۳ ص ۸۶ - ۹۳۔ [2] تفسیر المنار میں محکم و متشابہ کی بحث بہت مکمل موجود ہے۔ فاضل مصنف نے صرف اس مسئلہ پر ۳۳ صفحہ پر بحث کی ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

تیسری علامت | اتباع ہوی ہے۔ ہمارے پہلے مضمون میں اس پر آیات واحادیث کی روشنی میں کافی بحث گذر چکی ہے۔ ان ہر سہ علامات میں فرق یہ ہے کہ پہلی علامت یعنی اختلاف وتشتت کی شناخت ہر شخص کر سکتا ہے دوسری علامت کی شناخت صرف علماء راسخین کا حصہ ہے کیونکہ وہ محکمات و متشابہات کے فرق پر موقوف ہے اور اس کا علم علماء ہی کو ہو سکتا ہے۔ تیسری علامت خود انسان ہی کے فیصلہ کی بات ہے وہ خود ہی اس کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کے باطن میں اتباع ھدی کا جذبہ ہے یا اتباع ہوی کا۔

اب اگر آپ کو فرقہائے باطلہ کی شناخت کرنی ہے تو ان علامات سے کر لیجئے مگر ان علامات کے بعد بھی دائرۂ بحث ختم نہیں ہوگا اس لئے اس بحث کو تمام کرنے کا وہی ایک راستہ ہے جو یہاں صحابہ کرام نے اختیار فرمایا تھا یعنی ان ۷۲ فرقوں کی تعیین یا ان کی علامات پر سوال وجواب کی بجائے یہ تحقیق کر لی جائے کہ فرقہ ناجیہ کونسا فرقہ ہے یہ مفید بھی ہے اور مختصر بھی۔

فرقہ ناجیہ کی تعیین اور بقیہ فرقوں کے ابہام کی حکمت | صحابہ کرام ؓ نے اس راستہ کو اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ وہ یہ جانتے تھے کہ راہِ مستقیم بلا صاحب وحی کے بتلائے ہوئے قطعی طور پر دریافت ہی نہیں ہو سکتی اگر صرف ہماری عقل اس کے لئے کافی ہو سکتی تو انبیاء علیہم السلام کی حاجت ہی کیا رہتی اس لئے اس کی تعیین تو خود رسول ہی کی زبان سے ہو جانا چاہئے یہ امت کے اجتہاد پر سپرد کرنے کا مسئلہ نہیں ہے ہاں

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) اگر اس کے دوسرے اطراف وجوانب کا بھی لحاظ کیا جائے تو پورے ۶۴ صفحات پر یہ مباحث پھیلے ہوئے ہیں۔ اور محکم ومتشابہ کی تفسیر میں دس اقوال پیش کرنے کے بعد یہ اختیار کیا ہے کہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس کی مراد بالکل غیر معلوم ہو بلکہ اس کو غیر معقول قرار دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ جس شے کا ہم ادراک نہیں کر سکتے وہ متشابہات کے معانی نہیں بلکہ ان کی پوری پوری کیفیات ہیں مثلاً صفات الٰہیہ کی کیفیت، جنت ودوزخ اور دوسرے عالمِ غیب کی تفصیلی کیفیت، استواء علی العرش اور قیام قیامت کی کیفیت اور اس قسم کے دوسرے امور ان کے نزدیک قرآن کریم میں صرف متشابہ اضافی ہے متشابہ حقیقی کا کوئی وجود نہیں جو لوگ متشابہات پر دور حاضر کے اعتراضات کا جواب دینا چاہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے ان کے کلام کا اصل ماخذ حافظ ابن تیمیہؒ کی سورۂ اخلاص کی تفسیر ہے۔ محمد بن ابراہیم وزیر نے بھی اس جگہ مفید کلام کیا ہے۔
(دیکھو الروض الباسم ج ۲ ص ۵۲)

شاہراہِ نجات متعین ہو جانے کے بعد سبل منحرفہ کی تعیین امت کے اجتہاد کے سپرد کی جا سکتی ہے گویا عمل کے لئے میدان صاف کر دیا گیا ہے اور صرف نظری مرحلہ میں امت کے فہم و اجتہا کا امتحان لیا گیا ہے

شریعتِ محمدیہ صفتِ اعتدال میں اتنی اتم و اکمل ہے کہ دوسرے مللِ مستقیمہ ہیں گویا "الصراط المستقیم" اس کا ایک لقب بن گیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ جتنا توازن، جتنا اعتدال، جتنا اقتصاد اور میانہ روی اس شریعت میں ملحوظ ہے اتنا دوسری شرائع میں نہیں۔ شریعت موسویہ و عیسویہ کے افراط و تفریط کا حال معلوم ہے، گو وہ اپنے زمانہ کا توازن درست رکھنے کے لئے کتنی ہی معتدل ہوں مگر اس شریعت کے اعتدال کے بالمقابل رکھی نہیں جا سکتیں آخر وہ اصر اور اغلال (شدید احکام) کیا چیزیں تھیں جسے شریعتِ مصطفویہ نے میزانِ شریعت سے نکال کر اعتدال کی صورت پیدا کی ہے۔ اسی وصفِ ممتاز کے لحاظ سے اس امت کو امتِ وسط کہا گیا ہے اس لئے یہاں ادنیٰ ادنیٰ انحراف بھی نمایاں ہو جاتا ہے اور وہ صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے سبل کی صورت میں نظر آنے لگتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے۔ و

عَلَى اللهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ

سہل تستری فرماتے ہیں کہ "قصد السبیل" یعنی میانہ راستہ طریقِ سنت ہے اور "منہا جائر" ملل و سبل متفرقہ ہیں۔ مجاہد نے اس کو اور زیادہ صاف الفاظ میں بیان کیا ہے وہ "قصد السبیل" کی تفسیر میں فرماتے ہیں

المقتصد بين الغلو والتقصير و — یعنی میانہ روی یہ ہے کہ نہ اس میں غلو اور مبالغہ

ذلك يفيد ان الجائر هو الغالي — ہو اور نہ کوتاہی رہے اس کے بالمقابل جائر کا مفہوم

او المقصر وكلاهما من اوصاف — یہی ہوگا کہ اس میں یا تو غلو نظر آئے یا کوتاہی، یہ

البدع [1] — دونوں مللِ منحرفہ کے اوصاف ہیں۔

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ اقتصاد اور اعتدال کتنی کٹھن منزل ہے اگر پلہ ذرا جھکتا ہے تو غلو ہوا جاتا ہے اگر ذرا اٹھتا ہے تو تقصیر کا الزام عائد ہوتا ہے اس لئے اعتدال کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہمہ وقت شریعت پر ترازو کی طرح ٹکٹکی بندھی رہے کہ کہیں ڈگمگاتی تو نہیں ہر بوالہوس کے یہ نصیب کہاں

این شربتِ عاشقیت خسرو — بے خون جگر چشید نتواں

[1] الاعتصام ج ۱ ص ۳۷۔

ہم فی النار
لا واحدۃ

یہاں ایک شبہ یہ بھی پیش آرہا ہے کہ اس امت کی اکثریت اگر جہنم میں ہو تو یہ امتِ مرحومہ کیسے ہوسکتی ہے۔ ہمارے نزدیک اصولاً یہ سوال ہی غلط ہے یہ فیصلہ ابھی بل از وقت ہے۔ درمیانی مراحل سے گذر کر جب یہ امت جنت میں داخل ہو جائے اس وقت یہ توازن ائم کرنا چاہیے کہ دوسری امتوں کے مقابلہ میں یہ امت زیادہ ہے یا کم اس وقت یہ صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ درحقیقت یہ امت امتِ مرحومہ ہے یا نہیں۔ [۱]

نیز یہ بھی تو سوچیے کہ اس امت کی ضرب المثل وحدت، اس کی خدا ترسی، راستبازی، اہمی ہمدردی و سلوک یہ اس کے دورِ عروج کی باتیں ہیں اس کے برعکس اس کا افتراق و تشتت اس کا نفرق و کجروی یہ اس کے دورِ زوال کی داستان ہے کسی قوم کے دورِ عروج کی تاریخ اس کے دورِ زوال یں پڑھنے کی سعی کرنا بڑا ظلم ہے جن احادیث میں اس امت کی خیریت و برتری موجود ہے ان ہی میں س کے دورِ انحطاط کا یہ افتراق مذکور ہے پھر اس میں تردد و شبہ کی کیا بات ہے۔

کلہم فی النار
کی تحقیق

یہاں ایک بڑے عالم محقق نے یہ جواب دیا ہے کہ "کلہم فی النار" دراصل ایک محاورہ ہے جو کسی چیز کے غلط اور ناقابلِ قبول ہونے کے موقعہ پر بولا جاتا ہے جیسا کہ اردو میں کہہ دیتے ہیں کہ "اسے چولہے میں ڈالو" یہاں درحقیقت دوزخی ہونا مراد ہی نہیں مگر ہمیں اس جواب میں تردد ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے دوسرے الفاظ میں "واحدۃ فی الجنۃ" صرف ایک فرقہ جنت میں ہوگا" موجود ہے۔ لفظ نار اور جنت کا تقابل یہاں اس محاورہ کی گنجائش نہیں دیتا

ہمارے نزدیک حدیث کی راجح مراد وہ ہے جو حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے بیان فرمائی ہے اور جس کو شاہ عبدالعزیزؒ نے جزوی اصلاح کے ساتھ اپنے فتاویٰ میں نقل فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس ایک فرقہ سے مراد وہ فرقہ ہے جو بلا کسی ادنیٰ عذاب کے جنت میں جائے گا اور یہ وہ ہوگا، جس میں اعتقادی اور عملی کسی پہلو سے بھی بدعت نے راہ نہ پائی ہوگی اگر بنا بر بشریت کوئی عملی کمزوری اُن سے

۱؎ ترمذی میں روایت ہے کہ اہلِ جنت کی کل صفیں ایک سو بیس (۱۲۰) ہوں گی جن میں اسّی (۸۰) اِس امت کی اور بقیہ چالیس سب امتوں کی۔

سرزد بھی ہوگئی ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی رحمت یا اسے معاف کردے گی ورنہ قبر اور محشر کے شدائد میں کہیں اس کا حساب مجری کرلے گی۔ اس کے بالمقابل جو باطل فرقے ہیں ان کو اپنے افتراق و تشتت کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ اس کے بعد وہ بھی جنت میں چلے جائیں گے آخر کار اس امت کا ہر ہر فرقہ کچھ عذاب پاکر یا بلا عذاب جنت میں داخل ہوجائے گا۔ یہی مطلب ہوسکتا ہے ابن عمرؓ کی اس حدیث کا۔

ما من امۃ الا و بعضھا فی النار ہر ایک امت کے کچھ لوگ جنت میں اور کچھ دوزخ
وبعضھا فی الجنۃ الا امتی میں جائیں گے صرف ایک میری امت ہے
فانھا کلھا فی الجنۃ جو پوری کی پوری جنت میں جائے گی۔

یہ حدیث معجم اوسط اور معجم صغیر میں طبرانی نے روایت کی ہے۔ صاحب جمع الفوائد فرماتے ہیں کہ اس کی اسناد ضعیف ہے تاہم اس کی مراد وہ ہے جو ہم نے ابھی آپ کے سامنے ذکر کی ورنہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس امت کے لئے مدارِ نجات صرف کلمۂ توحید ہے اور معصیت موجبِ عذاب نہیں۔ یہ اہلِ سنت والجماعت کا مذہب نہیں ہے مرجئہ کا مذہب ہے۔ صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ آپ نے اپنی امت کے بعض افراد کو بچشم خود دوزخ میں دیکھا پھر یہ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ یہ تمام امت بلا عذاب جنت میں داخل ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ ظاہر یہی ہے کہ اس فرقہ سے وہی فرقہ مراد ہے جس نے سنت پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا ہے۔ بدعت سے وہ ہمیشہ دور اور نفور رہا ہے، اس کے اعتقاد و عمل کے دونوں بازو درست ہیں یہی فرقہ سیدھا جنت میں داخل ہوگا اور لفظ "ما انا علیہ واصحابی" بھی زیادہ اسی پر چسپاں ہوتا ہے۔

(آئندہ مضمون میں اس کی تحقیق کی جائیگی)

(باقی آئندہ)